## باب نمبر۔1

# اوائلِ عمری

میری زندگی کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو کے کئی زاویے ہیں، جن کو اگر قلم بند کیا جائے تو ہر زاویے سے مختلف رنگوں کی دھنک نظر آنے لگتی ہے کہ جن کی روشنی میں میری زندگی کے مختلف تجربات وواقعات اور کئی ایسے لوگ سامنے آتے ہیں کہ جن کے وجود نے میری زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

قلم اُٹھایا تو سوچا اپنی زندگی کے چند واقعات یادداشت کے طور پر لکھ لوں۔ لکھنے بیٹھا تو یہ واقعات ایک کہانی کی شکل میں ڈھلنے لگے اور ایک وقت وہ آیا کہ میری اِس کہانی نے ایک طویل داستان کی شکل اِختیار کر لی۔ یہ اور بات ہے کہ اِس داستان کے کئی سِرے تھے، شروع میں یہ بھی اُلجھن تھی کہ آغاز کروں تو کہاں سے کیونکہ میری ذاتی زندگی اور سفارتی زندگی اَس طرح آپس میں گڈ مڈ ہو چکی ہے کہ مَیں اُسے الگ کرنا بھی چاہوں تو شاید ممکن نہ ہو۔

1958 کے موسم بہار میں وزیر آباد سے میری زندگی کی کہانی کا آغاز ہوُا۔ وزیر آباد پاکستان کے صوبہ پنجاب میں لاہور سے تقریباً سو کلومیٹر دُور دریائے چناب کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ یہ ایک صنعتی شہر ہے جس کی تاریخ بتاتی ہے کہ مغل بادشاہ شاہ جہاں کے وزیر، حکیم علم الدین

انصاری، جنہیں وزیر خان کے نام سے بھی جانا جاتا تھا، نے سترھویں صدی میں اس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ بعد میں، سکھ حکمرانوں نے اُنیسویں صدی میں یہاں ایک نیا شہر تعمیر کیا۔

قصبے کے ابتدائی نقشے سادہ شہری منصوبہ بندی کے نمونہ تھے — مرکزی بلیوارڈ کے اطراف میں بازار اور سڑکوں کا جال اور وقت کے ساتھ، بڑھتی ہوئی آبادی نے ان کشادہ سڑکوں کو بھیڑ بھری گلیوں میں بدل دیا، جہاں بازار، رکشے، ٹرالیاں اور مختلف سامان سے لدی گاڑیاں افراتفری میں چلتی تھیں۔ برطانوی دور میں، 1867 میں یہاں ایک مناسب میونسپلٹی قائم کی گئی اور 1901 کی مردم شماری کے مطابق، وزیرآباد کی آبادی تقریباً اٹھارہ ہزار تھی۔ یہ قصبہ جمّوں کو وسطی پنجاب سے جوڑنے والے اہم سنگم کے طور پر جانا جانے لگا۔

ہمارا خاندان نسلوں سے وزیرآباد میں مقیم رہا ہے۔ ہمارے خاندانی شجرے کے مطابق، سترھویں صدی کے وسط میں، میرے اجداد نے اسلام قبول کیا اور حضرت شیخ راؤ کا نام اپنایا۔ اگرچہ خاندان زمیندار تھا، لیکن راؤ کے پانچویں پشت میں ہمارے پہلے حکیم، حکیم شیخ احمد، نے حکمت (جڑی بوٹیوں کے علاج) کی مشق شروع کی جو اگلی سات نسلوں تک جاری رہی، میرے دادا حکیم ذکاء اللہ تک، جو ہمارے خاندان کے آخری حکیم تھے۔ میرے دادا کے چچا، حکیم سلطان علی، جنہوں نے میرے دادا کو گود لیا تھا، ایک کامیاب حکیم تھے اور انہوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں علاقے کے برطانوی گورنر کی بیماربیوی کا کامیابی سے علاج کر کے کافی زمینیں حاصل کیں۔ ہمارا خاندان حویلی حکیماں میں رہتا تھا، جو شہر کے مرکزی بازار کے قریب واقع تھی۔

میرے دادا ذکاء اللہ کے بارے میں خاندان کے بزرگوں سے جو باتیں میں نے سنی ہیں، وہ انہیں ایک عزت دار اور ملنسار شخص کے طور پر پیش کرتی ہیں، جو اپنی نرم اور باوقار شخصیت کے لیے مشہور تھے۔ وہ کم بولتے تھے، لیکن جب بولتے تھے تو نرمی اور مقصدیت کے ساتھ۔ انہیں سیاست کا بھی شوق تھا اور اس میں فعال حصہ لیتے تھے۔

دادا ذکاء اللہ سیاست کے گہرے شوقین تھے اور اپنے دن کا بڑا حصہ 'مغربی پاکستان' نامی

ایک علاقائی اردو اخبار کے صفحات میں گم گزار دیتے تھے۔ شاید ایک سیاست کے شوقین کے لیے یہ اِس قسم کی کارگزاری حیران کن نہیں تھی، کیونکہ اُس وقت نوجوان قوم کے سیاسی منظرنامے کی رِیت تیزی سے بدل رہی تھی۔ اُس وقت کے فوجی حکمران جنرل ایوب خان نے متعدد اصلاحات متعارف کروائی تھیں جنہوں نے مقامی سطح تک انتخابی نظام کو متاثر کیا۔ میرے دادا نے بھی ایک نشست کے لیے انتخاب لڑنے کی کوشش کی، لیکن کہا جاتا ہے کہ آخر کار ان کے سیاسی لباس میں سب سے بڑا رخنہ اُن کے خیالات کی حکومتی آمریت کے خیالات سے عدم مطابقت ثابت ہوا۔ وہ الیکشن ایک مقامی ایوب حامی امیدوار سے ہار گئے۔

میرے دادا کی سیاسی سوچ قائداعظم محمد علی جناح کی بہن محترمہ فاطمہ جناح سے زیادہ ہم آہنگ تھی، جنہوں نے چند سال بعد ایوب خان کے خلاف صدارتی انتخابات میں حصہ لیا۔ میرے بڑے بھائی سجاد، جو نوعمری میں دادا دادی کے ساتھ رہتے تھے، اُن کی یادداشت کے مطابق اُن دنوں الیکشن کے ابتدائی وقت میں وہ حلقے کی تنگ گلیوں میں گھومتے ہوئے، نعرے لگاتے اور دیواروں پر پوسٹر چسپاں کرتے ہوئے گزارتے تھے۔ میری دادی اَمینہ بیگم علمی دنیا میں ممتاز تھیں۔ ایک باشعور اور پڑھی لکھی خاتون، انہوں نے اپنا بچپن بھوپال میں گزارا، جہاں ان کے والد سول انجینئر تھے۔ اَمینہ بیگم کو تعلیم کا شوق تھا اور وہ برطانوی ہندوستان کے مختلف شہروں میں تعلیم دیتی رہیں۔ اسلامی فکر میں ان کا علم بہت وسیع تھا اور ان کے شاگرد دُور دُور سے اُن کے لیکچر سننے آتے تھے۔

میرے دادا دادی کا تعلق بریلوی فقہ سے تھا اور وہ اعتدال پسند صوفی روایات کے پیروکار تھے۔ وہ شیخ عبدالقادر گیلانی کے مرید تھے، جنہیں غوث پاک کہا جاتا ہے، اِسی لیے میری دادی باقاعدگی سے گیارہویں شریف کا اہتمام کرتی تھیں۔ صوفی اسلام کے اثر کی وجہ سے وزیرآباد میں مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کے درمیان کافی ہم آہنگی تھی۔ تینوں اہم اسکول، ہندو ہائی، مشن ہائی اور میونسپل بورڈ ہائی مختلف مذاہب کے طلباء کو داخلہ دیتے تھے۔

میرے چچا بتاتے ہیں کہ اِن تمام برادریوں میں اِتنا زیادہ تضاد ہونے کے باوجود، اُن

سب کے درمیان کبھی بھی کوئی بڑا تنازعہ نہیں ہوا۔ مذہبی تقسیم کے باوجود لوگ ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہوتے تھے۔

1947 میں تقسیمِ ہند کے ہنگامے نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ تقریباً تمام ہندو اور سکھ وزیر آباد سے چلے گئے اور دوبارہ کبھی واپس نہیں آئے۔ ہمارا ددھیالی خاندان تقسیم سے زیادہ متاثر نہیں ہوا کیونکہ وہ سب پہلے ہی سے وزیر آباد میں مقیم تھے اور بڑی حد تک محفوظ رہے اور ہمارا ننھیالی خاندان بھی افراتفری شروع ہونے سے پہلے امرتسر سے لاہور منتقل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اُس وقت پاکستان کی نوازیدہ ریاست ابتدائی مراحل سے گزر تھی اور تقسیمِ ہند کے بعد دنیا میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔ ایک ایک کر کے خودمختاری کی عمارتیں کھڑی کی جا رہی تھیں۔ میرے والد شفیق احمد نے 1940 کی دہائی میں ملٹری اکاؤنٹس سروس میں شمولیت اِختیار کی اور پھر بہتر معاشی مواقع کے لیے وزیر آباد سے لاہور منتقل ہوئے اور وہاں مستقل طور پر آباد ہونے کا فیصلہ کیا۔ گو کہ وزیر آباد نے آزادی کے بعد کافی ترقی حاصل کی، تاہم خطّے کا مرکز لاہور شہر تھا جہاں کی اشرافیہ نے سفید فام آقاؤں کی جگہ لے لی تھی اور وہ اپنی جاگیریں کاروبار میں داؤ پر لگانے کے لیے بے دریغ سرمایہ کاری کر رہے تھے۔ لاہور کی ترقی اور مختلف کاروباری بلکہ دیگر کاموں کے سلسلے میں بہتر مواقع دیکھ کر ملک بھر سے لوگوں نے لاہور کی جانب ہجرت شروع کر دی۔

یہی کچھ دیکھ کر اَبی جی، (مَیں اپنے والد کو اَبی جی کہا کرتا تھا)، لاہور روانہ ہو گئے، کہتے ہیں کہ اَبی جی اگرچہ مُلک کے مختلف خطّوں میں رہے، لیکن وہ ہمیشہ لوٹ کو لاہور آجاتے تھے۔ اَبی جی کی شخصیت باوقار اور محترم تھی، اور ان کے دوستوں کا ایک بہت بڑا حلقہ تھا۔ وہ زندگی میں مشکل ترین لمحات کو آسان بنانے کی قدرت رکھتے تھے۔ ان کی مثبت سوچ نے انہیں ایک عظیم اور ذہانت سے بھرپور شخصیت میں ڈھال دیا تھا، شاید اِسی لیے وہ اپنی اور دوسروں کی زندگی کی دُشواریوں کو بہت مہارت سے آسانیوں میں تبدیل کر لیا کرتے تھے اور یہی اُن کی پہچان تھی۔ چونکہ ہمارا خاندان جاٹ لنگاہ کے طور پر جانا اور پہچانا جاتا تھا۔ میرے والد اور ان کے بھائیوں نے غیر رسمی طور پر چودھری کا کنیت استعمال

کرنا شروع کر دی۔ اپنی پرورش کے اعتبار سے مَیں اپنے آپ کو لاہوری سمجھتا ہوں، لاہور وہ شہر ہے جس نے میری یادوں کو تشکیل دینے اور میری سوچ کے کینوس کو وسیع ہونے میں مدد کی، اور لاہور ہی وہ شہر ہے کہ جہاں میرے زیادہ تر قریبی رشتہ دار آباد ہیں۔ تاہم، میرے لیے وزیر آباد کا شہری ہونے کا فخر کبھی کم نہیں ہوا۔ اس قصبے کے بہت سے معروف لوگوں کے ساتھ وابستگی میرے ذہنی احساس کو تقویت بخشتی ہے۔

میرے نانا، عبدالرحمان خان، امرتسر میں پیدا ہوئے تھے، جو لاہور کے تقریباً 30 کلومیٹر مشرق میں واقع، اب بھارتی پنجاب میں ہے۔ ان کے اجداد نے افغانستان سے ہجرت کی تھی، اور ہجرت کے بعد جالندھر میں رہائش اختیار کی۔ میرے نانا کی چار بیویاں تھیں، اور میری نانی کشمیری تھی۔ وہ میری ماں کی زندگی کے اوائل میں ہی وفات پا گئیں جب میری ماں، جنہیں میں امی جان کہتا تھا، ابھی بہت چھوٹی تھیں۔ اس کے بعد سے، امی جان اپنے بڑے بھائی عبدالرشید خان (ماموں رشید) کے ساتھ رہتی تھیں، جنہوں نے ایک باپ کی طرح ان کی پرورش اور دیکھ بھال کی۔ امی جان کا نام شہزادی تھا اور یہ نام کئی طریقوں سے ان کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اُن کی شخصیت ایک فیاض اور انتہائی خوش طبع شخصیت تھی۔ اس کے باوجود کہ انہوں نے زندگی میں کئی مشکلات کا سامنا کیا، مثال کے طور پر اُنہوں نے زندگی کے کئی مرحلوں پر ذاتی نقصان اور بیماری کا سامنا کیا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر، انہوں نے زندگی کو چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے آراستہ کر لیا۔ اَمی جان کا یہ عزم اور اُن کی مثبت سوچ نے میرے اپنے نظریات اور میری شخصیت پر گہرا اَثر ڈالا۔

امی جان کو ہمیشہ یہی افسوس رہا کہ ان کی اپنی ماں ان کی زندگی میں اتنی جلدی فوت ہو گئی تھیں۔ کبھی کبھار ان کی آواز میں ہلکی سی لرزش اور سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ مجھے بتاتیں کہ قیامت کے دن وہ اپنی ماں کو نہ پہچاننے کے امکان سے خوفزدہ رہتی تھیں۔ آخر وہ کیسے کر سکتی تھیں؟ جب ان کی یادیں دھندلی ہو چکی تھیں۔ اس کے باوجود، بے چینی کے اس احساس کی جگہ اکثر ماموں رشید کی کامیاب زندگی کے لیے شکر گزاری نے لے لی، جنہوں نے امی جان کی پرورش میں بے حد محبت اور مستقل مزاجی دکھائی۔

# سفارتی نقوش

میں اکثر سوچتا ہوں کہ کاش میں ماموں رشید کے بارے میں مزید جان پاتا جن کی شخصیت میری پیاری ماں کے لیے اتنا زیادہ اہم تھی۔ چونکہ ہمارا ننھیالی خاندان کے ساتھ رابطہ کچھ حد تک محدود تھا، اس لیے میں ماموں رشید کے بارے میں بہت کم جانتا ہوں، جو کچھ بھی مجھے معلوم ہوا وہ زیادہ تر میری والدہ کے بیانات پر مبنی تھا۔ مجھے وہ شامیں بہت یاد آتی ہیں جب امی جان اپنے بچپن کی یادیں بیان کرتیں، اور میں بڑے شوق سے سنتا تھا۔ میری پیشانی پر ہلکا سا ہاتھ پھیر کر وہ مجھے یہ احساس دلاتیں کہ دنیا میں اس سے زیادہ محفوظ جگہ کوئی نہیں ہو سکتی۔

اَمّی نے بتایا تھا کہ ماموں رشید 1947 کی تقسیم سے پہلے امرتسر میں کپڑے کے تاجر تھے۔ شاید انہیں آنے والے حالات کا اندازہ تھا، جس کی وجہ سے انہوں نے جلدی ہی امرتسر کا اپنا آراستہ گھر لاہور کے کرشن نگر (جو بعد میں اسلام پورہ کہلایا) میں ایک ہندو تاجر کے فرنشڈ گھر سے بدل دیا۔ تقسیم کے بعد، انہوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری، لاہور میں اور بعد میں بیرون ملک بحرین اور سعودی عرب میں مختلف کاروبار کیئے۔ میرے کزن طارق نسیم نے میرے ننھیالی خاندان کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے میں میری مدد کی۔ طارق نسیم کی والدہ امی جان کی سب سے بڑی بہن تھیں۔ ان کے بارے میں میری ایک ہی یاد ہے کہ وہ ایک پیار کرنے والی خاتون تھیں، اور ان کا ذکر امی جان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ لے آتا تھا۔

جب تقسیم ہوئی تو ابا جی لاہور کے اندرون شہر میں مقیم تھے۔ جیسے جیسے سال گزرتے گئے، وہ مختلف شہروں میں رہائش پذیر ہوتے، جہاں بھی ان کا کام انہیں لے جاتا۔ جب بھی انہیں لاہور میں تعینات کیا گیا، ہم نے انہیں ہمیشہ خوش ہی پایا، جہاں وہ اپنے روزمرہ کے معمولات کی حفاظت ایسے کرتے جیسے ایک باغبان اپنے باغ کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس وقت، انیس سو ساٹھ کی دہائی کے اوائل میں، جب میں نے بچپن میں ہوش سنبھالنا شروع کیا، میرے والدین نسبت روڈ، لاہور کی اسٹریٹ نمبر 135 پر دو منزلہ مکان میں رہتے تھے، جو دو سینما گھروں، ناز اور نگینہ، کے پیچھے واقع تھا۔ نسبت روڈ کے مکان میں ہماری زندگی کی بہت سی یادیں ان دو سینما گھروں میں روزانہ تین شوز کے دوران چلنے والے سریلی گانوں

کے گرد گھومتی ہیں۔ ہمارے گھر کی دیواروں سے ڈھول کی تھام اور تیز ہارن کی آوازیں آتی تھیں۔ عید کی خوشیوں کے دوران، میرا کزن وقار اور میں اپنی عیدی کو خرچ کرتے ہوئے مقامی بازار میں کھانے کی اشیاء خریدتے تھے جب تک کہ ہمارے پاس پیسے ختم نہ ہو جاتے۔ نسبت روڈ اس وقت کے ایک مشہور اخبار مشرق کے دفتر، دیال سنگھ لائبریری اور دیال سنگھ کالج کے لیے مشہور تھا، دونوں کا نام ایک مخیر بینکر اور سماجی اصلاحات کے لیے سرگرم کارکن کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اِسی طرح گوالمنڈی اپنے دلکش اور گرم سموسے اور مقامی پکوانوں کے لیے مشہور تھا۔ وقار اور میں نے اپنی گرمیاں دیال سنگھ لائبریری میں کتابیں پڑھتے ہوئے گزاریں۔

1964 کے آس پاس، ہمارا خاندان لاہور چھاؤنی کے کم آبادی والے علاقے، ایلگن روڈ (جو کہ بعد میں سرور روڈ کے نام سے جانا گیا) پر واقع ایک سرکاری مکان میں منتقل ہو گیا۔ میرے بھائی وجاہت اور میں نے پی اے ایف پرائمری اسکول میں داخلہ لیا، جو ہمارے گھر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ تب میری عمر چھ سال تھی۔ نامعلوم وجوہات کی بنا پر میرا داخلہ اسکول میں کچھ دیر سے کیا گیا تھا کیونکہ یہ زیادہ تر پانچ سالہ طالب علم تھے جو پہلی جماعت میں داخل ہوتے تھے۔ بہرحال، میری ابتدائی تعلیم میری والدہ کے ہاتھوں ہوئی۔ انہوں نے مجھے ریاضی کے پہاڑے، کچھ بنیادی اردو، اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا سکھایا۔ اَمّی جان نے مجھے اتنی اچھی تربیت دی کہ جب میں اسکول میں داخل ہوا تو خود کو دوسرے طلبہ سے بہت آگے پایا۔ الفاظ کو درست طریقے سے ہجے کرنے اور بنیادی ریاضی کے سوالات حل کرنے کی میری صلاحیت نے مجھے برتری دی، اور میں نے پہلی جماعت سے ہی اعلیٰ پوزیشنیں حاصل کرنا شروع کر دیں، یہ عمل تقریباً میری پوری تعلیمی زندگی میں جاری رہا۔ مجھے شروع سے ہی مطالعہ کا شوق تھا اور ریاضی کے نمبر بہت آسانی سے سمجھ آجاتے تھے۔

پی اے ایف اسکول سے ایلگن روڈ تک اسکول جانے اور آنے کا پیدل سفر اَب بھی میری یادوں میں شامل ہے۔ تین کلومیٹر پیدل سفر انتہائی خوبصورت تھا۔ سیدھی سنگل سڑکیں، گہرے سبز پیڑوں سے لدی ہوئی اور انہی پیڑوں سے چھلکتی سورج کی روشنی جو زمین پر رقص کرتے سائے پیدا کرتی تھیں۔

میرے اسکول جانے والے دوست جو راستے میں رہتے تھے، ہمارے کارواں میں شامل ہو جاتے، اور ہم اکٹھے اسکول سے واپسی کا راستہ طے کرتے، خوشی اور ہنسی سے بھرے، کرکٹ پکڑتے اور دنیا کی پرواہ کیے بغیر ایک دوسرے سے دوڑتے۔

ہمارا گھر ایک پرانا لیکن اچھی طرح سے تعمیر شدہ ہٹ تھا جو کہ 1938 میں تعمیر کیا گیا تھا۔ 1938 کے بارے میں ہمیں اس لیے یقین تھا کہ یہ نمبر دیوار پر نمایاں کندہ تھا۔ گھر کو تین اطراف سے گھیرنے والا وسیع سبز لان باغ بہت خوبصورت اور وسیع تھا، جہاں ابی جی موسمی سبزیاں کاشت کرتے تھے۔ ہم جب اَبی جی کی مدد کرتے تو انعام کے طور پر، ہمیں تازہ گاجر، چقندر، کھیرے اور ٹماٹر ملتے تھے جنہیں ہم اخوش خوش کھاتے تھے۔ ہمارے پاس اپنی بھینسیں بھی تھیں، جن کا تازہ دودھ اور جو مرغیاں پالتے تھے ہم ان کے انڈے نوش کرتے۔ اس طرح ہمیں شہر میں رہتے ہوئے ایک گاؤں کا مزا بھی آتا تھا۔

اندرون لاہور کی ہلچل کے برعکس، جہاں سڑکیں تانگوں، رکشوں، بسوں اور ویگنوں سے بھری ہوتی تھیں، وہاں ایلگن روڈ کے آس پاس کا کنٹونمنٹ کا علاقہ پرسکون تھا، جہاں چند مکانات اور کافی ٹریفک تھی۔ موسم گرما کی لمبی دوپہروں کے دوران چھت کے پنکھوں کی مسلسل آواز کے علاوہ کوئی اور شور سنائی نہ دیتا تھا۔ شام کے وقت، میں اور میرے بہن بھائی باہر بھاگتے، اور اُس وقت تک کھیلتے جب تک کہ غروب آفتاب ایک گہرے سرخ شعلہ کے ساتھ دن کی روشنی کو لپیٹ میں لے لیتا، یا جب تک آسمان کو اندھیرا اپنی آغوش میں نہ لے لے اور زنگ آلود اسٹریٹ جھلملانے لگیں۔ یہ ہمارے لیے گھر واپسی کا اشارہ بھی تھا، کیونکہ ہمیں مغرب، شام کی نماز کے بعد باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

ایک دن میں نے اپنے دوست اور ہم جماعت بشارت سے ایک کتے کا پلّہ ادھار لیا، اور اسے اپنی تختی پر اٹھائے اپنے گھر لے آیا۔ ہم نے اس کا نام ٹامی رکھا اور وہ کئی سال تک ہمارے ساتھ رہا۔ ٹامی بہت چوکس تھا، اور تیزی سے ہمارے خاندان کا حصہ بن گیا۔ یہاں تک کہ میری والدہ، جو کتوں کو پسند نہیں کرتی تھیں اور انہیں گھر کے اندر نہیں جانے دیتی تھیں، سب سے پہلے پوچھتی تھیں کہ کیا ٹامی

نے کھانا کھایا ہے؟

ایلگن روڈ پر ہمارے گھر میں ایک خاص تبدیلی آئی کہ جب 1969 میں ہمارے گھر ٹیلی ویژن آیا۔ گو کہ ٹیلی ویژن ہمارے گھر دیر سے آیا تھا، کیونکہ یہ 1964 میں لاہور میں متعارف ہو چکا تھا، مگر ملک میں ٹیلی ویژن نے اُس دہائی کے آخر میں مقبولیت حاصل کی۔ ابتدائی طور پر یہ سروس شام کے چند گھنٹوں کے لیے تھی اور میرے چچا، چاچا انیس، نے ہم سے پہلے ایک ٹی۔ وی خریدا تھا، اس لیے ہم اکثر نسبت روڈ پر واقع ان کے گھر جاتے تھے تا کہ چند گھنٹے ٹی وی دیکھ سکیں۔ اس وقت اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ ٹی وی پر کیا چل رہا ہے، سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہم ایک زنگ آلود مربع باکس کے ذریعے دنیا کو دیکھ رہے تھے۔

ہمارا ٹی وی رُوسی ساخت کا تھا جس میں ڈایوڈ تھے جو کام کرنے سے پہلے چند منٹ لیتے تھے۔ محلے کے تمام بچے ہمارے کمرے میں جمع ہوتے اور ٹیلی کاسٹ ہونے والی تمام چیزوں سے لطف اندوز ہوتے۔ سب سے زیادہ مقبول اردو ڈرامے تھے جو آٹھ بجے نشر ہوتے تھے۔ ان ڈراموں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس وقت ٹریفک کی رفتار بھی کم ہو جاتی تھی کیونکہ اُس وقت کے کچھ ڈراموں نے پوری قوم کے دلوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

میری ابتدائی تعلیم صدر ایوب خان کے دورِ حکومت کے عروج کے ساتھ ہوئی۔ اُس وقت پاکستان ایک ابھرتا ہوا ستارہ تھا اور ترقی پذیر ممالک کے لیے اُمید اور ترقی کی ایک چمکتی ہوئی کرن تھا۔ بچپن میں بھی، جوش و خروش کی ایک غیر محسوس چمک تھی جو ترقی کی طرف بڑھتے ہوئے ملک کے قدموں کی نشاندہی کرتی تھی۔ اسکول کی نصابی کتابوں کے صفحات پر ترقی کی ترجیحات تفصیل سے بیان کی گئی تھیں اور اس پیش رفت کی تعریف کی جاتی تھی جو کہ آزادی کے بعد پاکستان کو نصیب ہو رہی تھی۔ میں پانچویں جماعت میں تھا جب ایوب خان نے 1968 مُلکی ترقی کی پہلی دہائی مکمل کی۔

اُس زمانے میں ہم اسکولوں میں پاکستان کی کامیابیوں اور حکومتی اور نجی شعبوں میں معاشی ترقی کا جشن منانے کے لیے باقاعدگی سے مباحثے اور پروگرام منعقد کرتے تھے۔ معاشرے کے تمام

طبقات، صنعتی ترقی سے لے کر زراعت میں سبز انقلاب اور سینما و فلم میں اختراعات تک، اعلیٰ کامیابیوں کے نئے دروازے کھول رہے تھے۔ مَیں ترقی کے حوالے سے اس دور کو پاکستان کا سنہری دور کہتا ہوں جب پاکستان دنیا بھر میں ایک قابل احترام نام تھا۔ تاہم، ہر کوئی اس رائے سے متفق نہیں ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ ایوب خان کے دور نے پاکستان میں جمہوری عمل کو روک دیا تھا۔

یہ سچ ہے کہ ایوب خان کی اقتدار پر چڑھائی جمہوری طریقوں سے نہیں ہوئی تھی۔ اس نے سیاست دانوں سے اقتدار چھین لیا تھا، جو اس وقت تک ایک دہائی سے زیادہ عرصہ تک ایک مستحکم سیاسی نظام تیار کرنے میں ناکام رہے تھے۔

ایوب خان نے یہ حقیقت جان لی تھی کہ معاشی اور ترقیاتی اشاریوں میں اضافے کے بغیر، ملک کا رخ موڑنے کی کوئی بھی کوشش ناکام ہوگی۔ اس کے بجائے، اُس نے پالیسی سازوں کو ترقیاتی ماڈلز اور معاشی نمو پر توجہ مرکوز کرنے کی ہدایت کی تا کہ پاکستان کو عالمی سطح پر ایک مستحکم مقام حاصل ہو۔ ان کوششوں کو بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا، اور پاکستان کے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبوں کو اقتصادی ترقی کی سیڑھی پر چڑھنے کی خواہشمند قوموں کے لیے ایک نمونہ قرار دیا گیا۔ دوسرا پانچ سالہ منصوبہ (1960–1965) خاص طور پر پاکستان میں معاشی ترقی کا کامیاب ترین دور مانا جاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جنوبی کوریا نے بھی پاکستانی پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے کی تقلید کی، جو آج دنیا میں جنوبی کوریا کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے ایک قابل ذکر نکتہ ہے۔

اِن برسوں میں صنعتی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہؤا اور اقتصادی ترقی کا گراف بُلند ہوتا گیا۔ پانی ذخیرہ کرنے اور توانائی کی پیداوار کے لیے بڑے ڈیم بنانے کے منصوبے بھی شروع کیے گئے۔ پاکستان کی ایئرلائن بحر اوقیانوس کے پار چلنے والی پہلی ایشیائی ایئرلائن بن گئی۔ تمام اشارے پاکستان کی ترقی کو ظاہر کر رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ ترقی کی جڑیں ہماری مٹی میں مضبوطی سے پیوست ہو چکی ہیں۔

ایوب خان نے مغربی کیمپ کی طرف بڑھتے ہوئے اس رفاقت کا بہترین فائدہ اٹھایا۔

انہوں نے ماؤنٹ ورنن پر امریکی صدر جان کینیڈی کے ساتھ کھانا کھایا اور برطانوی بادشاہوں کے ساتھ لندن مال میں استقبالیہ پریڈ دیکھی۔ انہیں مغرب کا سچا دوست کہا جاتا تھا، لیکن اندرونِ پاکستان، ہر شخص اِن بڑھتے ہوئے تعلقات سے خوش نہیں تھا۔ ان کے وزیر خارجہ، نوجوان اور پُرجوش ذوالفقار علی بھٹو نے مغرب نواز پالیسی کی بجائے چین کی طرف جھکاؤ اور بھارت کے خلاف سخت گیر پالیسی پر زور دیا۔ ایوب خان نے ان مطالبات سے اتفاق کیا، کیونکہ یہ دونوں جذبات پاکستان میں مقبول ہو چکے تھے۔ امریکی قیادت اس تبدیلی سے ناخوش تھی اور پاکستان سے مختلف رویے کی توقع کر رہی تھی۔

ایوب خان کی نئی خارجہ پالیسی جس میں پاکستان کو مغرب مخالف قائدین کے قریب دیکھا گیا، معاشی مدد کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی جس کی انہیں امریکی زیرِ تسلط بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے توقع تھی۔ ایوب خان دو متضاد دنیاؤں کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، جبکہ بھٹو ایک ایسی خارجہ پالیسی کے لیے کوشاں تھے جو امریکہ پر منحصر نہ ہو۔

امریکہ اور پاکستان کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کے دوران 1965 کی جنگ چھڑ گئی۔ پاکستان نے اگست کے پہلے ہفتے میں مقبوضہ کشمیر میں آپریشن شروع کیا، جس کا مقصد بھارت کو تنازعہ کشمیر کے حل کے لیے مذاکرات پر مجبور کرنا تھا۔ پالیسی سازوں نے جموں و کشمیر میں بغاوت کی توقع کی تھی، لیکن آپریشن اپنے مقاصد میں ناکام رہا۔ پاکستان نے اِکھنور پر قبضہ کرنے کے لیے ٹینکوں کا حملہ کیا، لیکن بھارت نے 6 ستمبر کو بین الاقوامی سرحد پار کرتے ہوئے پاکستان پر حملہ کر دیا۔

جب جنگ شروع ہوئی تو میں صرف سات سال کا تھا اور دوسری جماعت میں پڑھ رہا تھا، لیکن جنگ کے کچھ مناظر میری یادداشت میں نقش ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ نچلی پرواز کرنے والے ہندوستانی لڑاکا طیاروں کو دیکھنے کی کوشش کرتا تھا اور ہمارے اپنے ہوائی جہاز ان کے پیچھے تھے۔ ہم نے گھر کے عقبی لان میں ایک خندق کھودی تھی، جس میں ہم محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے، جنگ کے نتائج کی فکر کیے بغیر۔ جنگی طیاروں اور سائرن کی آوازیں بچپن کی بے تحاشا قہقہوں میں دَب کر رہ جاتیں۔ ہم ریڈیو پر چلنے والے متاثر کن قومی گیت گنگناتے جو کے ساتھ

قوم اور مسلح افواج کو مادرِ وطن کے دفاع کے لیے پُرجوش رکھتے۔ کچھ دنوں کے لیے، ہم لاہور سے باہر ایک قریبی گاؤں کٹار بند چلے گئے، جہاں امرود کے باغات ہم سب بچوں کے لیے ایک خوش گوار مشغلہ تھے۔

پاکستان میں 6 ستمبر کو یوم دفاع کے طور پر منایا جاتا ہے، کیونکہ اس دن پاکستان کی بہادر مسلح افواج نے بڑی دلیری اور عزم کا مظاہرہ کرتے ہوئے لاہور کی جانب بڑھتے ہوئے بھارتی فوجی دستوں کو کامیابی سے پسپا کیا۔ جو مغرور بھارتی جرنیل لاہور جم خانہ میں چائے پینے اور فتح کے مزے لینے کا دعویٰ کر رہے تھے، وہ سب لاہور کے گرد دفاعی حصار توڑنے میں ناکام رہے۔ ہمارے دل فخر سے پھول گئے جب ریڈیو پر میجر راجہ عزیز بھٹی کی کہانی سنائی گئی، جو لاہور کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ سترہ دن کے بعد جنگ بندی پر اتفاق ہوا، اور سوویت یونین کی سرپرستی میں جنوری 1966 میں تاشقند میں اَمن مذاکرات ہوئے۔ اس معاہدے میں بنیادی طور پر قیدیوں کے تبادلے اور عارضی جنگ بندی لائن کو مستقل لائن میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا گیا، جو 1971 کی جنگ کے بعد لائن آف کنٹرول کی شکل میں وجود میں آئی۔

کیا پاکستان نے 1965 کی جنگ جیتی؟ یہ سوال پاکستان میں کافی بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ زیادہ تر تجزیہ کار جنگ کے نتائج کو برابری کے طور پر بیان کرتے ہیں، جس میں کوئی بھی فریق فیصلہ کن طور پر نہیں جیت سکا۔ تاہم، میرے سمیت بہت سے پاکستانی یہ ماننا پسند کرتے ہیں کہ ہم نے جنگ جیت لی۔ یہ سچ ہے کہ پاکستان کشمیر میں اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکا، لیکن اہم بات یہ ہے کہ ملک بھارتی حملے کو پسپا کرنے میں کامیاب ہوا اور روایتی قوت اور ساز و سامان میں بھارت کے مقابلے میں کم ہونے کے باوجود اُسے روک لیا۔

اس جنگ سے پاکستانی قوم کو ایک بڑا فائدہ بھی ہوا، جو شاید غیر ارادی ہی تھا، اور وہ تھا قومی جذبہ، جو تحریک پاکستان کے بعد برسوں سے نظر نہیں آیا تھا۔ مقبول ترانے پاکستانی فوجیوں کی بہادری اور لڑنے کے جذبے کو شاندار خراج تحسین پیش کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میڈم نور جہاں کی سریلی آواز ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے ذریعے پوری قوم کے حوصلے بلند کرتی تھی۔

جنگ کا خاتمہ، تاہم، ایوب خان کے لیے ناخوش گوار تھا۔ نہ صرف ہم نے مقبوضہ کشمیر کو آزاد کرانے کے اپنے مقاصد حاصل نہیں کیئے، بلکہ مغرب میں ایوب کی خیر سگالی کو بھی دھچکا لگا۔ امریکہ اور مغربی ذرائع سے امداد کا سلسلہ بند ہو گیا۔ بھٹو نے ہوشیاری کے ساتھ صورت حال کا فائدہ اٹھایا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ اگرچہ ہم جنگ جیت چکے تھے، لیکن ایوب نے اُسے مذاکرات کی میز پر ہار دیا۔ یہ عوامی جذبات جلد ہی ایوب خان کے خلاف ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئے۔

بلاشبہ، میں نے 1960 کی دہائی کو جس عینک سے دیکھا، وہ ایک بچے کی عینک تھی، اور اس تناظر میں، پرائمری اسکول میں میرے سال کافی غیر معمولی تھے، جو پڑھائی اور کھیل کود میں صَرف ہوئے تھے۔ 1949 میں پاک فضائیہ نے جو اِسکول قائم کیا تھا، میں نے اُس اسکول میں 1964 میں داخلہ لیا جو کہ اَب تک مڈل اسکول میں تبدیل ہو چکا تھا۔ تمام اساتذہ میں سے، مَیں سب سے زیادہ مِس مُسّرت جہاں کو یاد کرتا ہوں، جو ایک شائستہ انداز کی نوجوان خاتون تھیں، جن کی مسلسل حوصلہ افزائی اور پیار نے میری دلچسپی سیکھنے، پڑھنے اور مقابلہ کرنے میں بڑھائی۔ مِس مُسّرت کا مَثبت رویّہ دوسرے اساتذہ کے سخت رویے سے بالکل متضاد تھا، جو کہ نے نوجوان طلباء کے دلوں میں خوف و ہراس پھیلانے پر بلاوجہ فخر کیا کرتے تھے۔ ایک بچے کو زندگی بھر سیکھنے کی جستجو کی طرف مائل کرنے میں اساتذہ کی بے مثال طاقت بہت غیر معمولی ہوتی ہے۔

رات کے وقت ابی جی کمروں میں پھیلی پیلے بلب کی روشنی میں ریڈیو سیلون سنتے تھے۔ اگرچہ یہ زیادہ تر پرانے ہندوستانی گانے نشر کرتا تھا، لیکن پاکستانی فلموں کے گانے بھی تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہے تھے۔ اس نے میرے اندر نہ صرف خاموشی سے مدھر دھنیں گانا بلکہ پاکستانی فلمی گانوں کے بول ڈائری میں لکھنے کی بھی دلچسپی پیدا کی۔ میں ڈائری کے بعد ڈائری لکھتا چلا گیا۔ میری ڈائیریوں کے صفحات لکھے ہوئے الفاظ سے بھرے ہوئے تھے۔ بعض اوقات تو مَیں اتنی زیادہ ڈائیری لکھتا کہ لگتا کہ تمام الفاظ اپنی جگہ بنانے کے لیے ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوں۔ ابی جی کو جب اس نئے شوق کا علم ہوا تو اُنہیں یہ بات پسند نہیں آئی۔ شاید اُنہوں نے سوچا ہوگا کہ اس سے مَیں زندگی میں ایک بے راہ

روی کی جانب مائل نہ ہوجاؤں جو میری تعلیم میں خلفشار کا باعث بنے گا۔ اَس طرح ابی جی نے میرے ڈائیری لکھنے پر پابندی عائد کردی۔

اسی دوران، میرے ماموں کے بیٹے بلّو ہمارے گھر آئے اور اِتفاقاً اُنہوں نے میری ڈائری پڑھی، وہ ہر سطر پر لکھے گئے گانوں کے بولوں کی گہرائی سے بہت متاثر ہوئے۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا، "پمّا (میرا عرفی نام) تُم تو بہت اچھا لکھتے ہو، ہر لفظ کے ساتھ ان کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی پھر اُنہوں نے امّی جان سے کہا، ''پھپھو آپ کو اسے فلمی اسکول میں داخل کروانا چاہیے"۔ امی جان نے چند لمحوں تک بلّو کو گھورا اور کہا۔ ''تو کیا تم میرے بیٹے کو جوکر بنانا چاہتے ہو تا کہ سب کی تفریح ہو؟'' پھر بلّو سے کہا، ''ہمارے گھر میں آئندہ اِس قسم کی فضول باتیں نہیں کرنا!'' اگرچہ یہ ہدایت اور ڈانٹ بلّو کو دی گئی تھی، لیکن مجھے لگتا ہے کہ امی جان کا اصل ہدف مَیں ہی تھا۔ اُس کے بعد میں نے کبھی بھی موسیقی کو ایک شوق کے طور پر نہیں اپنایا، حالانکہ کبھی کبھار میں موسیقی کے آلات سیکھنے کی کوشش ضرور کی۔ مجھے کبھی کبھار آج بھی اِس بات پر افسوس ہوتا ہے، کیونکہ میں حقیقی طور پر موسیقی سے لطف اندوز ہوتا تھا، اور کم از کم اسے ضمنی دلچسپی کے طور پر برقرار رکھ سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ بلّو اگر کچھ اور بار امی جان سے کہتے تو، لیکن میرا خیال ہے کہ کچھ چیزیں تخیل پر چھوڑ دی جائیں تو بہتر ہے۔

ابی جی اُن والدین میں سے نہیں تھے جو اپنے بچّوں کو بازوؤں میں گھماتے ہیں۔ وہ ٹری ہاؤس بنانے یا کرکٹ کی گیند سے کیچ کیچ کھیلنے والے بھی نہیں تھے۔ وہ اُن والدین میں سے تھے کہ جو اپنے بچّوں کی کامیابیوں پر یہی کہتے کہ تم اس سے بہتر کرسکتے تھے۔ ہر چیز سے بڑھ کر، وہ چاہتے تھے کہ اُن کے تمام بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہوں۔ اور زندگی سے ہم وہ کچھ حاصل کریں جو وہ نہ کرسکے۔ اور اس کے لیے اگر انہیں اپنے گیارہ سالہ بیٹے کو میلوں دور کسی دور دراز اسکول بھی بھیجنا پڑے، تو تو اُس میں بھی کوئی مُضائقہ نہیں۔

اور بالکل ایسا ہی ہوا، جب میں 1969 میں گورنمنٹ سینٹرل ماڈل اسکول میں منتقل ہوا، سرخ اینٹوں کی ایک شاندار عمارت جس نے برطانوی ہندوستانی نوآبادیاتی فنِ تعمیر کی روح اور مضبوطی کو مجسم کیا ہوا تھا— اُونچی چھت والے برآمدے، سرخ اینٹوں کے کالموں سے الگ کشادہ لابی اور لاہور

کے لوئر مال روڈ پر ایک شاندار جگہ پر ایک وسیع کھیل کا میدان۔ اس اسکول میں داخلے کے لیے بچّوں کو سخت مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ صرف اہلکاری امتحان پاس کرنا کافی نہیں ہوتا تھا، بلکہ اسکول کی پہلی شفٹ میں شامل ہونے کے لیے طلباء کو بہترین نمبروں کے ساتھ امتحان پاس کرنا ضروری ہوتا تھا۔ اُن دنوں اسکول میں دو شفٹیں چلائیں جاتی تھیں تا کہ اسکول کی عمارت کا بھرپور استعمال کیا جا سکے۔ سنٹرل ماڈل

اسکول میں میرا وقت ایلگن روڈ پر میرے پرائمری اسکول کے دنوں سے بہت مختلف تھا۔ ابتدائی دنوں میں، مَیں صبح سویرے گھر سے نکلتا، اس سے پہلے کہ سورج صبح کی دھند کو چھٹنے دیتا۔ میں ایک پولو گراؤنڈ سے پونے گھنٹے تک پیدل چل کر روٹ نمبر 1 پر دن کی پہلی بس پکڑتا، جو آر۔اے بازار (برطانوی دور کا رائل آرٹلری دستہ) سے کرشن نگر تک چلتی تھی۔ اگر دن کی پہلی بس چُھوٹ جاتی، تو مَیں دوسری بس کے ذریعے اسکول جاتا لیکن اسطرح مَیں بہت مشکل سے وقت پر اسمبلی میں شامل ہو پاتا۔

میں گورنمنٹ کالج کے اسٹاپ پر اترتا، نہ ختم ہونے والی ٹریفک سے گزرتا، لاہور کی ضلعی عدالتوں کے باہر وکلاء کے گروپوں کو دیکھتا، اور آخر کار اسکول پہنچتا۔ چھٹی جماعت کے طالب علم کے لیے، یہ ایک بہت مشکل مرحلہ تھا۔ مجھے پہلے دن میرے بڑے بھائی سجاد کے ایک دوست نے راستہ دکھایا، جو قریب میں ہی گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ اگلے دن سے، میں نے خود یہ سفر کرنا شروع کیا۔ میری چھٹی جماعت کے ٹیچر QW ایک لمبے، شاندار اور خوبصورت شخص تھے، جو اپنے شاگردوں میں دہشت پھیلانے کے لیے مشہور تھے۔ QW کا ماننا تھا کہ ایک تعلیم یافتہ بچہ وہ ہے جو انگریزی زبان میں مہارت رکھتا ہو اور نصابی کتابوں کے قواعد وضوابط کی سختی سے پیروی کرتا ہو۔ QW ہاتھ میں چھڑی لے کر کلاس میں چکر لگاتے، اور غلطیوں پر یا کتابیں نہ پڑھنے پر بچوں پر دہشت جمانے کے لیے ہماری میزوں پر یا کبھی کبھار ہماری پیٹھ پر مارتے۔ وہ اپنی پسند کے طلباء کے ساتھ بہت خوش گوار طریقے سے پیش آتے تھے اور اکثر طلباء کے والدین کے پیشے اور حیثیت کے بارے میں پوچھتے تا کہ بااثر گھرانوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو کلاس کی اگلی صفوں میں بٹھا سکیں اور ان کے ساتھ نرمی

برت سکیں۔ کسی طرح، میں نے QW کے سخت رویے کا مقابلہ کیا، اور جب میں ساتویں جماعت میں پہنچا، تب تک QW کا رویہ میرے ساتھ بہتر ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے اساتذہ کی عزت حاصل کرنا شروع کی۔ میں ہمیشہ اسباق کا پہلے سے مطالعہ کرتا تا کہ استاد کی تعریف حاصل کر سکوں، جو کہ اُس وقت کامیابی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

ساٹھ کی دہائی کے آخر تک، پاکستان 1965 کی جنگ کے معاشی نتائج کا سامنا کر رہا تھا، اور اس کے نتیجے میں سیاسی عدم استحکام پیدا ہو رہا تھا۔ امریکہ نے اقتصادی اِمداد معطل کر دی تھی اور اسلحے پر پابندی بھی عائد کر دی تھی۔ مغربی عطیے اور قرضہ جات میں کمی آتی جا رہی تھی۔ مجموعی طور پر کم اقتصادی بہاؤ کا مطلب مشرقی پاکستان کے لیے بھی کم حصہ تھا۔ مشرقی پاکستان میں حالات ایوب خان کے خلاف ہوتے جا رہے تھے۔ مشرقی پاکستان میں یہ تاثر تھا کہ مغربی پاکستان نے 1965 کی جنگ کے دوران ملک کے مشرقی بازو کے دفاع کو نظر انداز کیا تھا۔ تاہم، مغربی پاکستان کے بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ 1965 کی جنگ میں کشمیر کا تنازعہ زیادہ اہم تھا، اس لیے مشرقی پاکستانیوں کا اُس میں زیادہ کردار نہیں تھا۔ شیخ مجیب الرحمان نے اِن بگڑتے ہوئے حالات کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے مشرقی پاکستان کے لیے مزید صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کیا اور مارچ 1966 میں اپنے چھ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا۔ مغربی پاکستان میں، بھٹو نے بھی اپنے سیاسی عزائم کے لیے جارحانہ انداز میں کام کرنا شروع کر دیا۔

جون 1966 میں وزیر خارجہ کے عہدے سے استعفیٰ دیتے ہوئے، ذوالفقار علی بھٹو نے تاشقند اعلامیہ کو ہتھیار ڈالنے کے مترادف قرار دیا، اور 1967 کے آخر میں لاہور میں ایک کنونشن میں پاکستان پیپلز پارٹی (PPP) کے نام سے ایک نئی پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اس نئی پارٹی نے پاکستان پر حکومت کرنے کے لیے سوشلزم کے نظریے کو اپنایا، مگر بھٹو نے ملک کے قدامت پسند عوام کو راغب کرنے کے لیے اسے اسلامی سوشلزم کا نام دیا۔ بھٹو نے جموں و کشمیر پر مضبوط موقف اپنایا، خطے میں امریکہ کے کم اثر و رسوخ کا مطالبہ کیا، اور پارٹی کے سوشلسٹ منشور کے مطابق کارکنوں کے لیے زیادہ

حقوق کا مطالبہ کیا۔ بھٹو ایوب خان کے خلاف عوام کو مشتعل کرنے میں کامیاب ہوئے، اور ان کے مقبول نعرے "روٹی، کپڑا اور مکان" (کھانا، کپڑا اور مکان سب کے لیے) نے لوگوں کے دِلوں میں جگہ بنا لی۔ ایک اور مقبول نعرہ جو بھٹو نے لگایا وہ یہ تھا کہ ملک کے 22 خاندان ملکی وسائل کا استحصال کر رہے ہیں اور عوام میں عدم مساوات پیدا کر رہے ہیں۔ (بعد میں، جب بھٹو نے اقتدار سنبھالا، تو یہ نعرہ بھٹو کے بڑے کاروباروں کے خلاف کریک ڈاؤن اور صنعتوں کو قومیانے کی بنیاد بنا)۔

اس دوران ایوب خان، بھٹو کی اس عوامی تحریک اور شیخ مجیب الرحمان کے مسلسل اور بڑھتے ہوئے مطالبات سے مایوس ہو گئے۔ مالیاتی بحران نے پہلے سے ہی دستیاب قومی وسائل کا بڑا حصہ ختم کر دیا تھا۔ اس نے شیخ مجیب کو اپنے چھ نکات کی منظوری کے لیے جارحانہ انداز میں زور دینے اور سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا بہترین موقع فراہم کیا۔ ایوب خان کی اپنی صحت بھی بگڑ رہی تھی۔ انہوں نے ابتدائی طور پر بھٹو اور مجیب کو گرفتار کیا اور پھر انہیں ایک گول میز کانفرنس میں شامل ہونے کے لیے رہا کر دیا جو انہوں نے مارچ 1969 میں مصالحت کے لیے بلائی تھی۔ ایوب خان نے مذاکرات کی میز پر بہت سی رعایتیں دیں، جیسے کہ وہ خود اگلے صدارتی انتخابات کے لیے امیدوار نہیں ہوں گے اور یہ کہ مشرقی پاکستان میں اکثریتی ووٹ کو اس کا مناسب وزن فراہم کرنے کے لیے برابری کے فارمولے کو ترک کر دیا جائے گا۔

جب کوئی پیش رفت کرنے میں ناکام رہے تو ایوب خان نے 25 مارچ 1969 کو اقتدار اس وقت کے آرمی چیف جنرل یحییٰ خان کو سونپنے کا فیصلہ کیا۔ یحییٰ نے 1962 کے آئین کو منسوخ کر کے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ ملک کی ترقی اپنی جگہ سلب ہو کر رہ گئی۔ اس طرح پاکستان میں معاشی ترقی کے شاندار دور کا اختتام ہوا۔ مَیں اُس وقت پانچویں جماعت میں تھا، جب مجھے اسکول میں پاکستان کی ترقی اور کامیابیوں کے بارے میں پڑھایا جا رہا تھا، لیکن یہ کسی نے نہیں بتایا کہ اَب پاکستان کی معشت کسی ریت کے محل کی طرح ڈھ رہی ہے۔ ساٹھ کی دہائی کو زیادہ تر پاکستانی عظمت کا دور سمجھتے ہیں، جب پاکستانی پاسپورٹ کی دنیا بھر میں عزت کی جاتی تھی اور پاکستان کو ترقی کے لیے ایک

ماڈل ملک تصور کیا جاتا تھا۔ اب ایسا نہیں رہا۔

جنرل یحییٰ خان نے دسمبر 1970 میں پارلیمانی انتخابات کی راہ ہموار کرنے کے لیے ایک قانونی فریم ورک آرڈر کا اعلان کیا۔ مشرقی پاکستان کو 162 نشستیں دی گئیں، جو اس کی آبادی کے تناسب کے مطابق تھیں۔ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں کل 138 نشستیں تھیں۔ تاہم، کوئی ایوانِ بالا ایسا نہیں تھا جس میں تمام صوبوں کو پارلیمانی طرزِ حکومت میں وفاق کو مضبوط بنانے کے لیے

یکساں نمائندگی حاصل ہو۔ بہرحال، دسمبر 1970 میں جب انتخابات ہوئے تو ایک واضح جوش وخروش تھا۔ میں ساتویں جماعت میں تھا، اور اس عمر میں بھی، مَیں اور میرے ساتھی ان انتخابات کی اہمیت کو محسوس کر سکتے تھے۔ ہماری سوچ یقیناً ڈرائینگ روم میں ہونے والی ہمارے بزرگوں کی گفتگو سے متاثر تھی۔ زیادہ تر باتیں زمینی یا انتخابی اصلاحات کے بارے میں کم اور جنرل یحییٰ خان کی شخصیت کے بارے میں زیادہ تھیں، جن کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ وہ شراب نوشی کے بہت شوقین تھے اور قابل اعتراض کردار کی خواتین سے میل جول رکھتے تھے۔ بعد میں، جب ہم بڑے ہوئے، تو ہمیں جنرل یحییٰ خان کے غیر مہذب طرزِ عمل کے بارے میں زیادہ جاننے کو ملا اور یہ بھی آگاہی ہوئی کہ یحییٰ خان نے کس طرح ہماری اقدار کو حقارت کے ساتھ پامال کیا۔

انتخابات سے دو ماہ قبل، مشرقی پاکستان ایک بڑے طوفان کی زد میں آیا اور مغرب میں مقیم حکومت کی طرف سے فراہم کردہ امداد کی کمی کی وجہ سے مغربی پاکستان مخالف جذبات میں اضافہ ہوا۔ جب بالآخر انتخابات ہوئے تو پاکستان ٹیلی ویژن، جس نے کوئی چھ سال پہلے اپنی نشریات شروع کی

تھیں، نے رات کے وقت دو فلمیں نشر کیں کیونکہ انتخابات کے نتائج آہستہ آہستہ سامنے آ رہے تھے۔ مَیں اور میرے بہن بھائیوں نے اپنے بستر ڈرائینگ روم میں منتقل کیئے جہاں ہمارا ٹیلی ویژن رکھا گیا تھا۔ اور پوری رات جوش وخروش سے گزاری، فلمیں دیکھتے اور وقفے وقفے سے انتخابی نتائج سنتے

رہے۔ہم پوری طرح سے یہ نہیں سمجھتے تھے کہ انتخابات کے ملک پر کیا اثرات مرتب ہوں گے،لیکن رات بھر فلمیں دیکھنے کا موقع کافی جشن کا باعث تھا۔

جنرل یحییٰ خان کی تمام تر خامیوں کے باوجود، اُن کے زیر قیادت ہونے والے انتخابات کو پاکستان میں سب سے منصفانہ اور شفاف ترین انتخابات میں شمار کیا جاتا ہے۔شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں غلبہ حاصل کیا اور 162 میں سے 160 نشستیں حاصل کیں، جو اس بات کا عکاس ہے کہ ان کے چھ نکات میں شامل خود مختاری کے مطالبات مشرقی پاکستان کے لوگوں میں گونج اٹھے۔بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں 138 میں سے 81 نشستیں حاصل کیں۔ چونکہ شیخ مجیب نے 300 نشستوں پر مشتمل اسمبلی میں اپنی 160 نشستوں کے ذریعے مطلق اکثریت حاصل کی، اس لیے وہ حکومت بنانے کا حق دار تھا۔اس کے بجائے، جنرل یحییٰ نے قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے میں تاخیر کی، اور شیخ مجیب سے ان کے چھ نکات پر بات چیت شروع کر دی، جو بالآخر تعطل کا باعث بنی۔شیخ مجیب نے قدم بڑھایا اور کنفیڈریشن کے تحت مشرقی پاکستان کے لیے مجازی آزادی کا مطالبہ کیا۔یحییٰ خان نے انکار کر دیا، اور اس کے بجائے فوج کو کارروائی شروع کرنے کا حکم دیا۔

25 اور 26 مارچ 1971 کی درمیانی رات ڈھاکہ یونیورسٹی سے شروع ہونے والا ے فوجی کریک ڈاؤن نے پاکستان کی تاریخ میں ایک انتہائی المناک باب کا آغاز کیا۔ہماری مسلح افواج نے مکتی باہنی سے لڑنے میں عزم اور بہادری کا مظاہرہ کیا، ایک گوریلا مزاحمتی قوت جو فوجی اور سویلین بنگالیوں پر مشتمل تھی، فوجی کارروائی کی مخالفت کر رہی تھی۔ بعد میں بھارت بھی کھلے عام ملوث ہؤا اور مکتی باہنی کو پناہ اور اڈے فراہم کئے۔ پاکستانی فوج کے کئی یونٹوں میں بنگالی افسر تھے، جنہوں نے بغاوت کی۔فوج کے لیے یہ ایک ناممکن لڑائی تھی، ملک کے اپنے ہی لوگ ان کے خلاف ہو گئے۔اس جنگ کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔حمود الرحمٰن کمیشن نے اس بڑے پیمانے پر تباہی کی وجوہات کی وضاحت کی، لیکن ہمارے سیاسی آقاؤں میں یہ رپورٹ شائع کرنے کی ہمت نہیں تھی، کہ اس

اندوہناک سانحے سے سبق سیکھیں۔ کئی سال بعد، یہ میڈیا ہی تھا جس نے آخر کار رپورٹ کے اقتباسات کو ڈھونڈ نکالا اور اسے اپنے تمام آؤٹ لیٹس پر شائع کیا۔ اس کے باوجود، اِس معاملے کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

جنگ کے وقت میں پی اے ایف کالج سرگودھا میں تھا۔ میں نے کالج میں 5 ستمبر 1971 کو پری کیڈٹ کے طور پر شمولیت اختیار کی۔ شُروع کے دِنوں میں ہی تمام پری کیڈٹس کو قریبی پی اے ایف بیس لے جایا گیا، جہاں ہم نے جنگی تیاریوں کے لیے بھاری ریت کے تھیلے بھرنے میں مدد کی۔ دسمبر میں جنگ کے قریب، کالج بند کر دیا گیا، اور ہمیں گھر بھیج دیا گیا۔ مجھے 16 دسمبر کی شام اچھی طرح یاد ہے۔ ابی جی اور میرے چچا بی بی سی کی نشریات سننے کے لیے ہمارے ریڈیو کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے، جو اس وقت معتبر خبروں کا واحد ذریعہ تھا۔ ہمارا پاکستانی ریڈیو چینل خود اپنے آپ سے جھوٹ بولنے اور لوگوں کو جھوٹی ہمت بندھانے کا کام کر رہا تھا، لیکن حقیقت بہت جلد سامنے آ گئی۔ وہ بدقسمت شام، جب ہتھیار ڈالنے کا اعلان کیا گیا، میں نے اپنے بزرگوں کو دیکھا جو ہتھیار ڈالنے کی خبر سُن کو بچوں کی طرح رو رہے تھے۔

" کہاں تھا وہ ساتواں بحری بیڑا" ، ان میں سے ایک نے بڑبڑاتے ہوئے امریکی جنگی بحری بیڑے کا حوالہ دیا جس سے پاکستان کی مدد کے لیے خلیج بنگال میں مداخلت کی توقع کی جا رہی تھی۔ ہمارے لیڈروں نے ہمیں دھوکہ دیا۔ اس نئی دنیا کے بارے میں میرے ذہن میں سوالات گردش کر رہے تھے، جہاں ہمارے پیروں کے نیچے کی زمین سرک گئی تھی۔ جہاں مشرق اب مشرق نہیں رہا اور مغرب اب مغرب نہیں رہا۔ مَیں بڑوں سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ لیکن میں نے اپنے بڑوں کی

حالت زار دیکھ کر فیصلہ کیا کہ خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ ہر چیز ان کے لیے اتنی ہی نئی تھی جتنی کہ میرے لیے، اور اگر مَیں بھی کچھ کہتا تو میرے کچھ کہنے سے اُن سب کے دِل اور زیادہ بھاری ہو جاتے۔

مشرقی پاکستان میں ہماری فوجی مہم جوئی کا انتہائی شرمناک انجام ہوُا۔ 26 مارچ سے

16 دسمبر تک سمجھوتہ کرنے کے سینکڑوں مواقع ضرور ملے ہوں گے جو کہیں زیادہ باوقار ہوتا، چاہے وہ مشرقی پاکستان کی خودمختاری ہو یا کنفیڈریشن کا قیام۔ دردناک اور خونی علیحدگی جو نہ صرف پاکستانیوں بلکہ بنگلہ دیشیوں کو بھی ستا رہی ہے، جن میں سے بہت سے ہمارے متحدہ ملک کا ایسا خاتمہ نہیں چاہتے تھے۔ پاکستان بنتے وقت بنگالیوں نے مسلمانوں کے

لیے علیحدہ وطن کے طور پر پاکستان کے مطالبے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ برسوں بعد، جب مجھے واشنگٹن میں ہمارے سفارت خانے میں تعینات کیا گیا، میں کچھ پرانی فائلوں کو چھان رہا تھا کہ ستمبر 1971 میں ہمارے اُس وقت کے سفیر کا سیکرٹری خارجہ کو لکھا ایک خط مجھے ملا۔ اُس خط کے مُطابق، معروف امریکی سینیٹرز نے مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک کو محض ایک معمولی واقعہ قرار دیا تھا اور شورش کی خبروں کو پروپیگنڈہ سے تعبیر کیا تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ سے صرف تین ماہ قبل، مغربی پاکستان کے کرتا دھرتا لوگ ایک خیالِ خام میں تھے۔

1971 کی تباہی کا ذمہ دار کون تھا؟ بہت سے لوگوں نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ، سب سے زیادہ جنرل یحییٰ خان کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے، جو اُمورِ مملکت چلا رہے تھے۔ ان پر قومی اسمبلی کا اجلاس نہ بلانے اور شیخ مجیب کو حکومت بنانے کا موقع نہ دینے کی بنیادی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مجیب یقیناً متحدہ پاکستان کا وزیراعظم بننا پسند کرتا۔ اگرچہ مجیب مُلک کے مشرقی اور مغربی ونگز کے درمیان وسائل کے عدم توازن کو درست کرنے کے اقدامات کا ارادہ رکھتا تھا، اور اِس میں کوئی غلط بات بھی نہیں تھی۔

یہ دلیل بھی دی جاسکتی ہے کہ مجیب کا اقدام انتہائی سخت تھا اور وہ اپنے اس عمل میں بہت آگے تک چلے گئے، اور اِس عمل میں بھارت کے ساتھ ہاتھ ملا کر متحدہ پاکستان کو ختم کرنے میں بھرپور مدد کی۔ بھٹو بھی قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کی اجازت نہ دینے کے ذمہ دار ہیں۔ ایک مشہور اقتباس اُن سے منسوب ہے ''اُدھر تم، اِدھر ہم''، جس کا مطلب ہے کہ آپ مشرقی ونگ میں حکومت بنائیں، جب کہ ہم مغربی ونگ میں حکومت بناتے ہیں۔ ایک اور اقتباس جو اکثر بھٹو سے منسوب کیا جاتا ہے وہ یہ ہے

کہ اگر کوئی مشرقی پاکستان میں اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرے گا تو اس کی ''ٹانگیں توڑ دیں گے''۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ آیا یہ دونوں اقتباسات واقعی بھٹو سے منسوب ہیں یا نہیں، اس پر تنازعہ باقی ہے، لیکن دونوں یقیناً تاریخ میں گونجتے رہتے ہیں۔

یحییٰ، مجیب اور بھٹو کے علاوہ، ملک کے ٹوٹنے کا چوتھا بڑا کردار بھارت کا تھا، جس نے عالمی قوانین کی کھلی خلاف ورزی کی اور سقوطِ ڈھاکہ تک ہر معاملے میں ہر طرح سے مداخلت کی۔ جنگ کے بعد، بھارتی قیادت نے اپنی تاریخ کی کتابوں اور عجائب گھروں میں ''پلٹن میدان'' میں پاکستان کے جنرل نیازی کی جانب سے ہتھیار ڈالنے کی تصاویر نمایاں طور پر آویزاں کیں۔ اِندرا گاندھی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اِندرا گاندھی نے یہ تک کہا کہ ہم نے دوقومی نظریہ کو خلیج بنگال میں ڈبو دیا ہے۔ بی بی سی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں ان کا کہنا تھا کہ ہم نے ہندوستان میں مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دَورِ حکمرانی کا بدلہ لے لیا ہے، حالانکہ اس بیان کی سچائی قابل بحث ہے۔ بھارتی رہنماؤں کے اس موقف کے باوجود، مشرقی پاکستان کا سقوط دوقومی نظریہ سے متصادم نہیں تھا۔ بنگلہ دیش نے مغربی بنگال یا ہندوستان میں شامل ہونے کے بجائے ایک آزاد ملک بننے کا انتخاب کیا۔ دوسرا، نیا جغرافیہ 1940 کی قرارداد پاکستان کے قریب تھا، جس میں برصغیر پاک و ہند کے مشرقی اور مغربی حصے میں دو مسلم اکثریتی ریاستوں کا تصور دِیا گیا تھا۔

جنگ کے بعد، مَیں جنوری 1972 میں پی اے ایف کالج سرگودھا واپس آیا۔ ہمارے کیمپس کے ہالوں اور کلاس رومز میں اُداسی کی فضا تھی۔ بنگالی طلباء جو پہلے ہمارے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر مارچ کرتے تھے، اَب کالج چھوڑ کر جا چکے تھے۔ اِس اُداسی کے باوجود، کالج کے اساتذہ نے قابل ستائش کوشش کی کہ وہ اِسے ظاہر نہ ہونے دیں۔ صرف چند اساتذہ ہی نادانستہ اور کبھی کبھار طلباء کے ساتھ اپنا دُکھ بانٹتے تھے۔ تاہم ہم نے اُنہیں اچھی تعلیم دینے میں پہلے سے زیادہ پرجوش پایا۔ اُس وقت ایسا نہیں لگتا تھا، لیکن یہ جوش میری زندگی کے ایک متعین باب کو جنم دے رہا تھا، جو اسباق اور اقدار سے بھرا ہوا تھا جس کی پیروی مَیں کئی دہائیوں تک کرتا رہا۔